ذکر الٰہی ۔ طمانیت قلب حاصل کرنے کا قرآنی فلسفہ

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۶ رنومبر ۱۹۸۲ء بمقام مسجد اقصیٰ ربوہ)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

دنیا میں انسان جتنی مادی ترقی کرتا چلا جارہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ گوانسان کی آسائش کے بھی نئے نئے سامان مہیا ہور ہے ہیں، تاہم انسانی بے چینی ہر دم اور ہر آن بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ افراد بھی بے چین ہیں اور خاندان بھی بے چین ہیں۔ اور قومیں بھی بے چین ہیں اور (Blocks) بلاکس بھی بے چین ہیں۔ مشرق بھی بے چین ہے اور مغرب بھی بے چین ہے۔ شمال بھی اور جنوب بھی اور تمام دنیا میں انسان دن بدن زیادہ سے زیادہ شدید تر بے چینی میں بڑھتا جارہا ہے۔

بے چینی اور سکون دونوں کی جنگ تو ابتدائے آفرینش ہی سے جاری ہے اور ہمیشہ سے انسان کو سکون کی تلاش رہی ہے۔ لیکن زمانہ میں بعض ادوار ایسے بھی آتے ہیں جب کہ بے چینی بڑی شدت کے ساتھ غلبہ پا جاتی ہے اور سکون عنقا نظر آتا ہے جس کا ذکر کتابوں میں تو ملتا ہے لیکن یہ حقیقت میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ ایسے ہی زمانہ کو قرآنی اصطلاح میں خسر کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ وَالْعَصْرِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ﴿۳﴾ (العصر: ۲-۳) زمانہ گواہ ہے اور زمانہ کی بے چینیاں اور

بے قراریاں گواہ ہیں کہ انسان من حیث المجموع گھاٹے میں مبتلا ہے۔اور گھاٹے کا سودا کر رہا ہے۔ ہر تاجر جانتا ہے کہ گھاٹا کوئی تسکین قلب تو نہیں دیا کرتا۔ وہ تو دل میں ایک شدید بے چینی پیدا کرتا ہے۔

پس جہاں گھاٹے سے مراد کئی قسم کے نقصانات ہیں وہاں اس کا نتیجہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ جب بھی انسان یا زمانہ بحیثیت مجموعی گھاٹے میں مبتلا ہو جائے تو بے چینی کا بڑھنا اس کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔

جماعت میں سے بھی زمانہ کے ان حالات کا شکار ہو کر بہت سے دوست مجھے دعاؤں کے لئے خط لکھتے ہیں اور اپنے دل کی بے چینی کا اظہار کرتے ہیں اور بعض یہ بھی پوچھتے ہیں کہ اس کا علاج کیا ہے۔اور بعض دوست جو زیادہ حساس ہوتے ہیں اور زمانہ کی زیادہ فکر کرنے والے ہوتے ہیں، وہ لوگوں کے لئے بے چین ہوتے ہیں اور ان کے لئے دعاؤں کے خط لکھتے ہیں۔ابھی چند دن ہوئے ایک دوست نے خط لکھا کہ زمانہ کی بے چینی سے میں اتنا بے قرار رہتا ہوں کہ میری راتوں کی نینداڑ گئی ہے۔پس ایسے لوگ بھی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک رحمت کا دل عطا کیا ہے۔اپنے حالات درست بھی ہوں تو ماحول کے دکھ ان کو بے چین کر دیتے ہیں اور حقیقی انسان کا یہی تصور ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اپنا دکھ تو کوئی نہیں تھا لیکن ساری دنیا کے لئے بے چین تھے۔انسانیت کا یہی وہ اعلیٰ تصور ہے جو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔

پس سوال یہ ہے کہ آخر اس بے چینی کا علاج کیا ہے۔قرآن کریم نے اس کا کیا تصور پیش کیا ہے اور مختلف فلسفیوں اور اہل فکر نے اس کا کیا حل تجویز کیا ہے۔

جہاں تک انسانوں میں سے اہل فکر اور سوچ بچار کرنے والے انسانوں کا تعلق ہے۔ان میں جو گہری نظر رکھتے تھے انہوں نے اس کا یہ حل پیش کیا کہ انسان اپنی تمناؤں سے آزاد ہو جائے۔ ایک ایسا دل پیدا کرے جس میں کوئی خواہش باقی نہ رہے۔اور جب انسان کو یہ حاصل ہو جائے تو لازماً اسے سکون مل جاتا ہے اور طمانیت حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ بہت سے مذاہب کی بنیاد اسی فلسفہ پر رکھی گئی۔ بدھ مت یا جین مت یا اس قسم کے بعض اور بھی مذاہب ہیں جن کا نقطۂ ارتکاز یہی ہے۔ اسی سے آگے ان کا سارا فلسفہ پھوٹتا ہے یعنی انسان اگر تمناؤں سے آزاد ہو جائے تو اسے تسکین قلب

میسر آ جائے گی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن دنوں کشمیر میں تھے وہ اکثر سیر کے لئے جایا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ مہاراجہ کشمیر کے ہاں ملازم تھے۔ سیر کے دوران وہ بسا اوقات ایک ایسے فقیر کو دیکھا کرتے تھے جس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور وہ اکثر بے چین اور بے قرار نظر آیا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ سیر کو نکلے تو اس فقیر کو دیکھا وہ بہت ہی خوش ہے اور خوشی سے چھلانگیں لگا رہا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا سائیں! تمہیں آج کیا میسر آ گیا ہے تم اتنے خوش ہو۔ اس نے کہا جسے سب کچھ مل جائے وہ خوش کیوں نہ ہو۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ نے پوچھا۔ تم جیسے کل ننگے تھے، آج بھی ویسے ہی ننگے ہو۔ جیسی لنگوٹی کل تمہارے پاس تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔ مجھے تو کوئی زائد چیز نظر نہیں آ رہی جو تمہیں مل گئی ہو۔ اس نے کہا۔ آپ نہیں جانتے۔ آج میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ میری مراد کوئی نہیں رہی۔ پنجابی میں اس نے کہا ”جدی مراد کوئی نہ ہووے اودی پوریاں ہی پوریاں“ یعنی جب دل میں تمنا ہی باقی نہ رہے تو پھر پوری ہی پوری ہے۔ پھر انسان بہت تسکین حاصل کر لیتا ہے۔ غالبؔ نے بھی اس فلسفہ کو اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا۔

ے گر تجھ کو ہے یقین اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی، بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ (دیوان غالبؔ)

کہ اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ قبولیت کا یہ خاص لمحہ ہے تو پھر کوئی دعا نہ مانگو سوائے اس دعا کے کہ اے خدا! ایسا دل عطا کر کہ جس میں کوئی مدعا باقی نہ رہے۔ یہ دل تمہیں مل جائے تو تسکین ہی تسکین ہے۔

پس ایک یہ بھی فلسفہ ہے۔ جس نے بہت سے انسانوں کو ایک ایسے سکون کی تلاش میں مبتلا کر دیا اور آج بھی کر رکھا ہے کہ جو سکون ہمیشہ ان سے گریزاں رہتا ہے کیونکہ ایسا دل جو بے مدعا ہو اس میں سکون کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ سوسائٹی سے ایسا کامل گریز کہ جس کے نتیجہ میں کوئی تمنا باقی نہ رہے اسی کا دوسرا نام موت ہے اور موت کے سوا یہ مقصد انسان کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اگر ایسا دل ہو جس میں مدعا نہ رہے۔ سوسائٹی بے قرار ہو اور وہ دل اس کی بے چینی محسوس نہ کرے تو ایسے دل کے ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے کیونکہ جو انسان سوسائٹی سے اس طرح کٹ جائے کہ اس کے دکھ اور غم میں

شریک ہی نہ رہے، وہ انسان تو انسان کہلانے کا مستحق بھی نہیں رہتا۔

پس اگر چہ تمناؤں سے آزاد ہو جانے والا یہ فلسفہ بظاہر بڑا دیدہ زیب معلوم ہوتا ہے اور بعض فقیر اس فلسفہ کو اپنا کرنا چتے بھی دیکھے جاتے ہیں مگر قرآن کریم اس کو کلیۃً رد کرتا ہے۔ سارے قرآن میں ایسا کوئی تصور آپ کو نہیں ملے گا کہ یہ تعلیم دی گئی ہو کہ تم تمناؤں سے آزاد ہو جاؤ۔ ہاں تمناؤں سے اس طرح آزاد ہونے کی بجائے کہ کوئی تمنا ہی نہ رہے، قرآن کریم ایک ایسی راہ تجویز کرتا ہے جس پر چلنے کے نتیجہ میں تمنائیں مغلوب ہو جاتی ہیں۔ وہ انسان کی مالک نہیں رہتیں بلکہ انسان ان کا مالک بن جاتا ہے۔ وہ انسان کو اپنا غلام بنا کر نہیں رکھتیں۔ بلکہ انسان کی غلام بن جاتی ہیں اور اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ رہا یہ کہ وہ مقام کیسے حاصل ہوسکتا ہے، تو اس کے متعلق مضمون کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے۔

اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ اے سکون کے متلاشیو سنو! تمہیں کہیں طمانیت نہیں ملے گی سوائے اس کے کہ تم اپنے رب کے ذکر میں محو ہو جاؤ اور اللہ کی یاد شروع کر دو۔ اب اللہ کی یاد سے کیسے طمانیت حاصل ہو، اس مضمون کو خدا تعالیٰ نے مختلف رنگ میں بیان فرمایا ہے۔ قرآن کریم میں اس کی بہت تفصیل ملتی ہے کہ اس سے مراد محض ایک ایسا ذکر نہیں ہے جس کے نتیجہ میں انسان منہ سے اللہ اللہ کہنا شروع کر دے اور پھر سمجھے کہ اس کا دل تسکین پا جائے گا اور طمانیت حاصل کر لے گا بلکہ اس کے پیچھے ایک گہرا فلسفہ کارفرما ہے اور خود قرآن کریم اسے کھول کر بیان فرماتا ہے۔

ذکر الٰہی اور عبادت دراصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ جب تک انسان خدا کا عبد نہ بنے اس وقت تک اسے ذکر الٰہی کی توفیق ہی نہیں مل سکتی۔ ان دونوں چیزوں کا آپس میں ایک گہرا تعلق ہے۔ اس آیت میں وہ ذکر الٰہی مراد ہے جو 'عبد' کا ذکر ہو یعنی خدا کے ان بندوں کا ذکر ہو جن کو خدا تعالیٰ اپنی اصطلاح میں 'عبد' شمار کرتا ہے۔ وہ کن کو شمار کرتا ہے، وہ کون ہیں جو خدا کے عبد بن جاتے اور ذکر الٰہی کے مستحق بن جاتے ہیں۔ وہ کون ہیں کہ جب وہ اس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں تو پھر ان کا ذکر الٰہی کرنا ان کے لئے موجب تسکین بن جاتا ہے۔ ان کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب یہ مر رہے ہوتے ہیں تو بستر مرگ پر ان کو یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ﴿۲۸﴾ ارۡجِعِىۡۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً ﴿۲۹﴾ فَادۡخُلِىۡ فِىۡ عِبٰدِىۡ ﴿۳۰﴾ وَادۡخُلِىۡ جَنَّتِىۡ ﴿۳۱﴾ (الفجر: ۲۸-۳۱)

کہ اے میرے بندو! تم اس دنیا میں مجھ سے راضی ہو کر رہے۔ میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ جب تم مجھ سے راضی ہو گئے تھے تو تم مَّرۡضِيَّةً بھی بن گئے یعنی میں بھی تم سے راضی ہو گیا اور اسی مقام کا نام عبودیت ہے۔ فرمایا اس حالت کے بعد ہم تمہیں یہ خوشخبری دیتے ہیں فَادۡخُلِىۡ فِىۡ عِبٰدِىۡ اب تم حق رکھتے ہو کہ میرے بندے کہلاؤ۔ پس میرے بندوں کی صف میں داخل ہو جاؤ۔ وَادۡخُلِىۡ جَنَّتِىۡ اور جو کچھ میرے بندوں کا ہے وہ میرا ہے اور جو میرا ہے وہ میرے بندوں کا ہے۔ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً میں یہی تصویر کھینچی گئی ہے۔ پس میری جنتیں تمہاری جنتیں ہو گئیں۔ یہاں جنت کو الجنة نہیں کہا گیا۔ یہاں جنت کی کوئی باغوں والی تصویر نہیں کھینچی گئی بلکہ جَنَّتِىۡ کہا گیا ہے کہ میری جنت میں داخل ہو جاؤ یعنی جنت کا اس سے بڑا کوئی تصور نہیں کہ اللہ کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس جنت کا دوسرا نام رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً رکھا گیا۔ گویا انسان اپنے رب سے راضی اور اللہ اس کے راضی ہونے کے نتیجہ میں اس سے راضی ہو جائے۔

پس یہاں تمناؤں کو رد نہیں کیا گیا، تمناؤں کے رخ موڑ دیئے گئے ہیں۔ تمناؤں کی تربیت کی گئی ہے۔ تمناؤں کو ایسے رستہ پر چلایا گیا ہے جس کے نتیجہ میں تمنائیں بے چینی پیدا کرنے کی بجائے اطمینان پیدا کرنے لگ جاتی ہیں۔ یہ بہت ہی عجیب مضمون ہے اس کو دوسری جگہ خدا تعالیٰ اس طرح کھول کر بیان فرماتا ہے کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جنہوں نے اپنی تمناؤں کو اپنا معبود بنا لیا اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ ان کی آقا بن جاتی ہیں۔ ان کو دربدر لئے پھرتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے سکون کا پیدا ہونا ایک ایسی ناممکن بات ہے جس کا تصور ہی اس دنیا میں نہیں پایا جاتا۔ یہ ایک حسابی حقیقت ہے کہ جن کی تمنائیں ان کا معبود بن جائیں ان کو اس دنیا میں کبھی اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ حسابی حقیقت یہ ہے کہ تمناؤں اور حصول تمنا کی نسبت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ تمنائیں آگے بھاگتی ہیں اور حصول تمنا اس سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں کبھی کوئی ایسا مقام نہیں آیا کہ اس کی تمنا پوری ہو کر آگے پھر کوئی تمنا باقی نہ رہی ہو۔ ایک تمنا پوری ہو کر اگلی تمناؤں کے بچے پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ پھر نئی تمنائیں اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں اور اس طرح تمناؤں کی پیروی کا ایک ایسا لامتناہی سفر شروع ہو جاتا ہے جہاں ہر مقام پر بے چینی ہے ہر حصول تمنا ایک اور بے قرار تمنا پیدا کر دیتا ہے۔ قرآن کریم نے هَلۡ مِنۡ مَّزِيۡدٍ (ق:۳۱) کی جہنم کا جو نقشہ

کھینچا ہے وہ یہی نقشہ ہے۔ کوئی ایک بھی تو مقام ایسا نہیں جہاں انسان پہنچ کر یہ سمجھ لے کہ میں نے سب کچھ پا لیا اور مجھے چین نصیب ہو گیا۔ اس سے آگے اور مقام پیدا ہوتے ہیں اور اس سے آگے اور مقام پیدا ہوتے ہیں۔ ایک وادی مانگتا ہے تو دوسری وادیاں منہ کھولے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔

اس کے برعکس کچھ وہ لوگ ہیں جو اپنے اللہ کو اپنی تمنا بنا لیتے ہیں۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے یہی معنی ہیں۔ اسی لئے آنحضور ﷺ نے فرمایا:

اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تم جس ذکر کی تلاش میں ہو کہ وہ تمہیں سکون بخشے اور تمہاری طبیعتوں کو اطمینان عطا کرے، وہ ذکر تو اس فلسفہ کا نام ہے کہ اللہ تمہارا الٰہ ہو جائے۔ یعنی خدا خود تمہاری تمناؤں کا آخری مرکز بن جائے جو سب سے بالا اور سب سے افضل مقام ہے۔ گویا اس سے بڑھ کر کوئی تمنا نہ رہے۔ ظاہر ہے جب خدا مطلوب ہو جائے تو ہر دوسری تمنا اس کے تابع ہو جائے گی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی مختلف جگہ نظم میں بھی اور نثر میں بھی اس مضمون پر روشنی ڈالی ہے۔

آپؑ فرماتے ہیں:

؎ در دو عالم مرا عزیز توئی
و آنچہ می خواھم از تو نیز توئی (درثمین فارسی)

اے مرے آقا! مجھے تو دونوں جہان میں تو ہی عزیز ہے۔ وآنچہ می خواہم از نیز توئی۔ اور تجھ سے جو میں چاہتا ہوں وہ یہ کہ تیرے سوا میں کچھ اور نہیں چاہتا۔ مجھے صرف تو مل جائے گویا لا الٰہ الا اللّٰہ کی ہی یہ تفسیر ہے اور جیسا کہ قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے، خواہش کے آخری مقام کو الٰہ کہتے ہیں۔ کبھی وہ انسانی خواہش کا آخری مقام بن جاتا ہے۔ کبھی وہ حقیقتاً خدا ہو جاتا ہے جو اللہ ہے۔ فرمایا اگر لا الٰہ الا اللّٰہ کی رو سے اللہ تمہارا آخری مطلوب ہو جائے تو پھر تمہاری کوئی بھی خواہش تمہیں بے قرار نہیں کر سکتی کیونکہ اسی کا نام ہے راضی ہو جانا۔ پیارے کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے وہ پیارا لگنے لگ جاتا ہے کیونکہ انسان سمجھتا ہے پیارے ہاتھوں سے آیا ہے۔ پھر انسان یہ نہیں دیکھا کرتا کہ یہ کیا ہے۔ وہ پیارے کے ہاتھوں پہنچنے والے غم پر بھی راضی ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں پہنچنے والی خوشی پر بھی راضی ہو جاتا ہے۔ رَاضِيَةً کے یہی معنی ہیں۔ فرمایا ہم نے تمہیں مختلف

حالتوں میں رکھا۔ تمہیں دکھ بھی پہنچے۔ تمہیں خوشیاں بھی ملیں۔ تم اور لوگوں کی طرح بیمار بھی ہوا کرتے تھے۔ تم شفا بھی پا جایا کرتے تھے۔ تمہیں مالی پریشانیاں بھی لاحق ہوتی تھیں اور تمہاری پریشانیاں دور بھی ہو جاتی تھیں لیکن ہر حالت میں تم اپنے خدا سے راضی رہے۔ تم نے کبھی شکوہ نہیں کیا کہ اے خدا! میں تو تیری عبادت کرتا ہوں مجھے دکھ کیوں پہنچتا ہے۔ میں بیمار کیوں ہوا۔ میرے بچے کیوں فوت ہوئے۔ میری بیوی کو کیوں نقصان پہنچا۔ میری جائیدادیں کیوں تباہ ہوئیں۔ یہ سارے حالات جس طرح دوسرے انسانوں پر گزرے تھے اے میرے بندہ! تجھ پر بھی گزرتے رہے۔ اگرچہ یہ الگ بات ہے کہ دوسروں کی نسبت تو کم ابتلاء میں تھا۔ لیکن جہاں تک تیری ذات کا تعلق ہے تو بھی زندگی کے زیر و بم میں سے گزرا ہے۔ لیکن ہر حالت میں تو مجھ سے راضی تھا۔ غم کی حالت میں بھی تو مجھے یاد کیا کرتا تھا۔ خوشی کی حالت میں بھی یاد کیا کرتا تھا۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران: ۱۹۲) کی رو سے یہ تیری حالت تھی کہ راتوں کو بھی اٹھتا تو خدا کو یاد کرتا تھا۔ کھڑے ہو کر بھی یاد کرتا تھا لیٹے ہوئے بھی یاد کرتا تھا۔ بیٹھے ہوئے بھی یاد کرتا تھا۔ اسی طرح فرمایا يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۫ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۷﴾ (السجدۃ: ۱۷) کہ خدا کو یاد کرنے والے ایسے بندے بن گئے تھے کہ وہ طمع کی حالت میں بھی خدا کو یاد کرتے تھے اور خوف کی حالت میں بھی یاد کرتے تھے۔ یعنی وہ حالتیں جو دوسرے انسانوں کو خوف اور غم میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ ان میں بھی ان کو اللہ ہی یاد آیا کرتا تھا۔

پس اگر کسی وجود سے کامل طور پر محبت ہو جائے تو اس محبت کے نتیجہ میں اس کی ہر عادت اور ہر بات اور ہر ادا پیاری لگنے لگ جاتی ہے۔ اور اسی کا نام طمانیت قلب ہے یعنی انسان کو محبت کا ایسا مقام حاصل ہو جائے اور وہ کسی ایک وجود سے ایسا پیار کرنے لگے کہ پھر اس کی ہر بات پر راضی ہونا سیکھ جائے۔ لیکن یہیں تک بات نہیں رہتی۔ دنیا میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک انسان اپنے محبوب سے راضی رہتا ہے لیکن محبوب راضی نہیں ہوتا۔ ہر انسان کا اپنا اپنا مقام ہے کوئی خوبصورت ہے کوئی بدصورت ہے کوئی اعلیٰ علمی صلاحیتیں رکھتا ہے کوئی جہالت میں مبتلا ہے۔ قومی فرق ہیں، نسلوں کے فرق ہیں۔ مزاجوں کے فرق ہیں۔ انسانی دنیا میں اکثر ہم یہی دیکھتے ہیں کہ عاشق تو راضی ہوا پھرتا ہے اور معشوق راضی ہی نہیں ہونے میں آتا اور وہ بے چارا ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کے اپنے بھی تو کچھ

تقاضے ہیں۔اس کے اپنے بھی تو کچھ ذوق ہیں وہ بھی تو پورے ہونے چاہئیں۔اس لئے وہ عشق پھر بھی بے چینی پیدا کر دیتا ہے۔لیکن خدا تعالیٰ نے جس عشق کا ذکر فرمایا ہے وہاں ہر رضا کے ساتھ ایک متقابل رضا بھی ملتی ہے جو مَّرْضِيَّةً کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم جس مقام پر بھی ہو گے، خواہ تم اعلیٰ بندوں میں سے ہو یا ادنیٰ بندوں میں سے ہو، خواہ علماء میں سے ہو یا جہلا میں سے ہو، حسین لوگوں میں سے ہو یا بدصورتوں میں سے ہو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تم مجھ سے یا میری کسی ایک ادا سے بھی راضی ہو گئے تو اس کے جواب میں ایک مَّرْضِيَّةً کی حالت بھی پاؤ گے اور اس کا ایک جواب دیکھو گے۔میں ہمیشہ اس کے جواب میں تم سے راضی ہوا کروں گا اور تم سے اپنے پیار کا اظہار کروں گا۔ یہ ہے طمانیت قلب جس کا نقشہ قرآن کریم نے کھینچا ہے۔ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً اس حالت میں کہ ہر دفعہ جب عاشق اپنے معشوق سے راضی ہوتا ہے تو معشوق بھی رضا کی ایک ادا دکھاتا ہے، اس سے پیار کا اظہار کرتا ہے، اسی کا نام طمانیت قلب ہے۔اس کے سوا طمانیت قلب حاصل کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔جاہل ہیں وہ لوگ جو اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرے رستوں میں طمانیت کی تلاش کیا کرتے ہیں۔

پس وہ لوگ جو مجھے خط لکھ کر پوچھتے ہیں اور دنیا کی بے قراری کا علاج چاہتے ہیں ان کو میں بتا دیتا ہوں کہ اس علاج کے سوا مجھے تو کوئی اور علاج نظر نہیں آتا کہ اپنے رب سے محبت پیدا کریں اس کو اپنا مطلوب بنالیں۔اس کو اپنا مقصود بنالیں اور پھر اس سے راضی ہونا سیکھ جائیں۔آپ اس رضا میں جتنا آگے بڑھتے چلے جائیں گے اتنا ہی آپ عبودیت میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے عبد بنتے چلے جائیں گے۔اور جب کوئی انسان خدا کا کامل عبد بن جائے تو اس سے ایک اور نتیجہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہی کامل عبد ہوتا ہے جس کا اپنا کچھ نہ رہے۔اپنے وجود سے کلیۃً خالی ہو جائے اور پھر جو کچھ اس کو مالک دیتا ہے وہی اس کا ہوتا ہے۔یعنی سو فیصدی مالک پر منحصر ہو جاتا ہے۔جب اپنا کچھ نہیں رہا تو جو کچھ بھی مالک سے ملتا ہے بطور عطا ہی ملتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔جب ہم تمہیں ہر دوسری چیز سے خالی کر دیں گے یعنی تمہاری تمنائیں تو رہیں گی لیکن میری غلام بن کر رہیں گی۔آزاد تمنائیں نہیں رہیں گی۔غالب تمنائیں نہیں رہیں گی۔میری یاد کے نیچے مغلوب ہو جائیں گی۔تب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جو کچھ میرا ہے وہ تمہارا ہو جائے گا۔تب تم میرے عباد میں

داخل ہو جاؤ گے اور عباد میں داخل ہونے کا مطلب ہے وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ تم میری جنتوں میں داخل ہو جاؤ گے۔

یہ وہ مقام ہے جو ایک لحاظ سے ایک درجہ تک اس دنیا میں بھی انسان کو حاصل ہو جاتا ہے۔ خدا کے جتنے برگزیدہ بندے انبیاء کی صورت میں ہمیں نظر آتے ہیں یا جو دوسرے نسبتاً ادنیٰ مقامات پر ہوتے ہیں ان میں بھی ہم درجہ بدرجہ رضا کا یہی مقام دیکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے رب سے پیار کا ایک بڑا پیارا واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے جو دراصل اسی فلسفہ کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ نے ایک ضرورت کے وقت ایک نئی جگہ میں جہاں آپ کا کوئی ساتھی نہیں تھا، کوئی واقف نہیں تھا کوئی مددگار نہیں تھا، ایسی حالت میں بیٹھ کر دعا کی۔ آپ کسی اور کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے۔ صرف اپنے رب سے مانگنا چاہتے تھے اور اس کے سوا کسی اور سے مانگنے کی عادت ہی نہ تھی لیکن کوئی سہارا نہیں تھا۔ خوف کی وجہ سے اپنے وطن سے نکل گئے تھے۔ ایک نئی قوم میں جا کر سوچ رہے تھے کہ اب میں کیا کروں۔ چنانچہ وہاں بیٹھے بیٹھے انہوں نے یہ دعا کی:

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۵﴾ (القصص: ۲۵)

کیسی عجیب تمنا ظاہر کی ہے۔ کہتے ہیں اے میرے رب! تو جو کچھ بھی مجھے دے وہی میری تمنا ہے میں اسی پر راضی ہوں۔ میں فقیر اس چیز کا ہوں جو تو مجھے عطا کرے۔ یعنی کچھ نہیں بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں، میری کیا تمنائیں ہیں، میری کیا ضروریات ہیں، میں بھوکا ہوں، میں شادی کے بغیر ہوں، مجھے سہارا چاہئے، ایک نئے قبیلہ میں آیا ہوں۔ مجھے کوئی نہ کوئی سایہ چاہئے جس کے تحت میں یہاں زندگی گزاروں۔ اور بے شمار ضروریات ہو سکتی تھیں۔ لیکن کیسا پیارا فقرہ دماغ میں آیا ہے۔ کیسی پیاری سوچ ہے۔ معلوم ہوتا ہے بڑا غور کیا ہوگا کہ آخر میں اپنے رب سے کیا مانگوں۔ اتنی ضرورتیں کیا بتاؤں۔ اتنی لمبی چوڑی تقریریں کیا کروں۔ پھر یہ سوچا ہوگا کہ میں تو اپنے اللہ سے محبت کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میری محبت کے جواب میں وہ ہمیشہ مجھ سے محبت ہی کرتا ہے تو کیوں نہ یہ معاملہ اس پر چھوڑ دوں۔ اس کو بھی یہ پتہ ہے کہ جو کچھ مجھے دے گا میں اس سے راضی ہو جاؤں گا اور مجھے بھی یہ پتہ ہے کہ مجھے وہی دے گا جس سے میں راضی ہوں گا تو اس کے بعد پھر اور مانگنے کا سوال ہی کیا باقی رہ جاتا ہے۔ اس لئے آپ یہ دعا کرتے ہیں:

رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ ﴿۲۵﴾ (القصص:۲۵)

کہ اے خدا! میں تو فقیر بنا بیٹھا ہوں اس چیز کا جو تو مجھے عطا کرے۔ یہی بات ایک اچھی ادا کی شکل میں مغربی تہذیب میں اس رنگ میں پائی جاتی ہے (جس قوم میں بھی کوئی اچھی بات ہو اسے سراہنا چاہئے) مغربی قوموں میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی ان کو تحفہ دیتا ہے تو جس فرد کو تحفہ دیا جاتا ہے وہ آگے سے یہ جواب دیتا ہے کہ آپ نے ایسا تحفہ دیا کہ بالکل اسی چیز کی مجھے ضرورت تھی، میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ یہ جواب تو دراصل خوش کرنے کے لئے ایک رسمی جواب ہے لیکن اس کے پیچھے جو فلسفہ کارفرما ہے وہ بالکل درست ہے۔ اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ جو کچھ آپ نے مجھے دیا ہے مجھے اس کی ضرورت تھی تو اس سے زیادہ خوشی اس کو نہیں پہنچ سکتی کہ اسے یہ احساس ہو کہ بعینہٖ اس کی مرضی اور ضرورت کے مطابق میں نے اسے کوئی چیز دے دی ہے۔ پس دنیا کی تہذیبوں میں بھی یہ بات اچھی لگتی ہے لیکن ویسے حقیقت سے عاری ہوتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کبھی اتفاقاً کسی کو کوئی ایسا تحفہ ملتا ہوگا جس کی اسے ایسی ضرورت ہو کہ گویا اسی کے انتظار میں بیٹھا ہے لیکن وہ یہ جانتے ہیں کہ تحفہ قبول کرنے کا اصل مزہ اور تحفہ دینے والے کے شکریہ کا بہترین اظہار یہی ہے کہ انسان کہے کہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھنے سے قبل کہ خدا نے کیا دیا ہے یہ فقرہ کہا کیونکہ وہ تو یہ جانتے تھے کہ میں اپنے رب سے ایسا پیار کرتا ہوں کہ یقیناً پوری سچائی کے ساتھ میں اپنے رب سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ تیری طرف سے آئے گا مجھے اس کی ضرورت ہے، میں اس کا فقیر بنا بیٹھا ہوں۔

پس جب انسان کسی سے ایسے محبت کرے کہ اس کی ہر عطا اس کی ضرورت بن چکی ہو گویا اسی کے انتظار میں بیٹھا تھا تو ہر تمنا پوری ہوئی کہ نہ ہوئی اور کوئی تمنا ماری نہیں جارہی۔ ایسی تعلیم نہیں دی جارہی جو انسانی فطرت کے خلاف ہو یعنی یہ کہ تمناؤں سے عاری ہو جاؤ بلکہ یہ فرمایا جارہا ہے کہ تمناؤں کو مغلوب کردو ایک اعلیٰ تمنا کے حصول میں۔ یعنی تم اگر اللہ کے ہو جاؤ تو تمہیں ہر دوسرے سے آزادی نصیب ہو جائے گی۔ مرد آزاد کا اس سے بہتر اور کوئی تصور نہیں کہ رب کی غلامی کے بعد ہر دوسری غلامی سے انسان آزاد ہو جائے۔ اور وہ اس طرح کہ اس کی تمنا انسان کی ہر دوسری تمنا پر غالب آجائے کیونکہ اس کے بغیر آزادی حاصل ہو ہی نہیں سکتی جب تک تمناؤں کو ایک اعلیٰ تمنا سے

مغلوب نہ کیا جائے۔ ورنہ یوں انسان بغیر تمنا کے تو زندگی نہیں گزار سکتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم قرآنی فلسفہ کے مطابق طمانیت قلب حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات کی بھی توفیق عطا فرمائے کہ اس زندہ جاوید فلسفہ کو ساری دنیا میں پھیلا دیں اور تمام دنیا کی بے چینی ذکر الہٰی کے اس مفہوم کے ساتھ دور کریں جس کو قرآن کریم نے پیش فرمایا ہے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ ۳؍مارچ ۱۹۸۳ء)